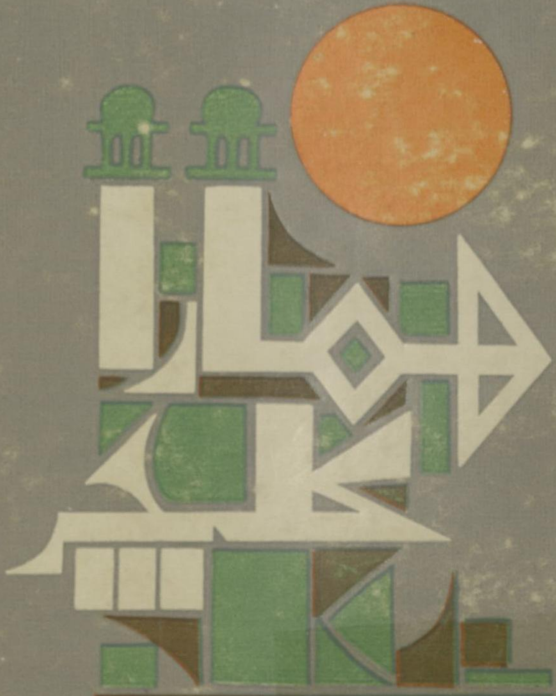

کوثر نیازی

ہمارا کلچر

کوثر نیازی

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
ACC No. 011609
MAILSI

جملہ حقوق محفوظ

کتاب خانہ سردار جھنڈیر
میلسی (پاکستان)
نمبر شمار : ....
....
کتاب نمبر : ....
....

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور

طبع اوّل : نومبر ۱۹۷۶ء

قیمت : چار روپے

تعداد : سات ہزار

901.549
ح ۷ ٥

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

مقامِ اشاعت :

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

سہ روزہ کُل پاکستان قومی سیمینار
برائے پاکستانی ثقافت
نیشنل کونسل آف کلچر اینڈ آرٹس
میں
صدارتی خطبہ
مورخہ ۱۲ مئی سنہ ۱۹۷۶ء

حرفِ آغاز

زیرِ نظر صفحات اصل میں میری ایک تقریر پر مشتمل ہیں جو
مَیں نے نیشنل کونسل آف آرٹس اینڈ کلچر کے زیرِ اہتمام کلچر کے
موضوع پر ہونے والے سہ روزہ سیمینار کا افتتاح کرتے
ہوئے کی تھی ۔ تقریروں کی اشاعت کے وقت ان میں مواد
کا اضافہ کرنا مَیں دیانت کے منافی سمجھتا ہوں ایسا کرنا تالیفات
میں تو جائز ہے لیکن جس مضمون کو تقریر کہہ کر قارئین کے سامنے
پیش کیا جا رہا ہو اسے من وعَن تقریر ہی ہونا چاہیے ۔ یہی سبب
ہے کہ ٹیپ سے اس تقریر کو منتقل کرنے کے بعد اسے جوں کا توں
کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے ۔

کلچر کا موضوع کچھ وقت سے ہمارے بعض علمی اور ادبی
حلقوں میں بہت مقبول ہے ، بڑے بڑے جغادری دانشور اس
سلسلے میں دُور کی کوڑی لا رہے ہیں ۔ بعض بحثوں نے تو فکری انتشار

کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے اور عالم یہ ہے کہ اب تیس سال کے بعد بھی اس بدنصیب قوم کو اس شک میں مبتلا کیا جا رہا ہے کہ اس کا کوئی کلچر ہے بھی کہ نہیں۔ مَیں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میری یہ تقریر اس موضوع پر فیصلہ کن ثابت ہو گی کیونکہ منصبی ذمّہ داریاں بسا اوقات حرفِ برہنہ کہنے کی متحمل نہیں ہوتیں مگر مَیں نے کوشش کی ہے کہ زبان اور دل کی رفاقت کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے کہ یہی ایک "دلِ زندہ" کی علامت ہے اور مَیں نہیں چاہتا کہ اس کی تپش سے محروم ہو کر مَیں "زندگانی" کی نعمت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔

کوثر نیازی

اسلام آباد

۲۳-اگست ۱۹۷٦ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میں کونسل کو اس سہ روزہ سیمینار کے انعقاد پر تہِ دل سے مبارک باد دیتا ہوں اس لیے کہ یہ ایک بڑا بامقصد اجتماع ہے۔ بدقسمتی سے پچھلے قریب کے زمانے میں بعض لوگوں نے اس موضوع پر جن خیالات کا اظہار کیا اس سے کچھ ذہنی انتشار پیدا ہوا۔ اور ۲۸ سال کے بعد لوگوں کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ہماری ثقافت کیا ہے اور اس ثقافت کی تلاش کے سلسلہ میں ہم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

جہاں تک کلچر اور اس کے ذیلی مباحث کا تعلق ہے اس سیمینار کے دوران مختلف اجلاسوں میں آپ جو تقاریر سنیں گے ان سے یقیناً آپ کے ذہن میں ایک

خاکہ ابھرے گا۔

میں صرف بعض اشارے کرنے پر اکتفا کروں گا۔ اس لیے کہ یہ موضوع اپنے گوناگوں اور متنوع مباحث کی وجہ سے اتنا طویل ہے کہ یہ ایک کتاب کا طالب ہے۔ اور ایک تقریر میں اس کی سمائی نہیں ہو سکتی۔ کلچر ایک ایسی اصطلاح ہے جو اہل یورپ نے وضع کی اور اس سے کئی نظریات پیدا ہوئے۔ مارکس کا نظریہ، اسپنگلر کا نظریہ، فرائیڈ کا نظریہ، ٹوائنبی کا نظریہ اپنی مختلف تشریحات کے ساتھ اور بعد کے برسوں میں طرح طرح کی باتیں کی گئیں اور کئی دوسرے مفکّروں نے نئے نئے نظریات پیش کیے۔ ایک نظریہ یہ قائم کیا گیا کہ کلچر بھی ایک وحدت ہے ایسے ہی جیسے زندہ جسم کی وحدت ہوتی ہے۔ جس طرح وہ پیدا ہوتا ہے۔ اور موت کے گھاٹ اُترتا ہے ایسے ہی کلچر پیدا ہوتا ہے اور پھر فنا کے گھاٹ اُتر جاتا ہے۔ پھر ایک نظریہ یہ پیدا ہُوا کہ یہ بات کلچر کے بارے میں کہنا صحیح نہیں ہے —— Civilization کے بارے میں کہنا صحیح ہے، تمدّن کے بارے میں تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تمدّن پیدا ہوتا

اور ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن کلچر کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ وہ مٹ کر بھی اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ اور ایک عمل تناسخ کی طرح دوسرے کلچروں میں اس کا اثر رونما ہوتا ہے اور اس طرح وہ ایک پُرانے کلچر کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور نیا کلچر بن جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح لامتناہی طور پر چلتا چلا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ کلچر ایک تاریخ اور ایک تاریخ ہی نہیں بلکہ تاریخ کا منطقی تقاضنا ہے تاریخ کی تخلیق ہے یا تاریخ سے عبارت ہے اور تاریخ ایک تخلیقی حرکت ہے تاریخ آگے بڑھ رہی ہے جو کلچر اس تاریخ کی حرکت اور اس کی جُوئے رواں کا ساتھ دیتے ہیں وہ آگے بڑھتے ہیں نشوونما پاتے ہیں پروان چڑھتے ہیں اور جو کلچر اس تغیّر و تبدّل کی جُوئے رواں میں یعنی تاریخ کی حرکت میں پیچھے رہ جاتے ہیں وہ ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی نمائندگی وہ انسان کرتے ہیں جن کو متحجر کہا جاتا ہے، جو حجر سے عبارت ہیں، جو پتھر کے بنے ہُوئے ہیں اور جن کی مثال غارنشیں انسانوں سے دی جاسکتی ہے۔ جو غار کے زمانہ کے لوگ تھے جو کلچر حرکت اور انقلاب کا ساتھ دینے سے قاصر

رہتے ہیں وہ عجائب گھروں کی زینت تو بن جاتے ہیں مگر وہ زندگی کے کوئی نقش نہیں چھوڑتے بلکہ نقش و نگار طاق نسیاں بن کے رہ جاتے ہیں۔ پھر یہ بحث چلی کہ کلچر کی رُوح کیا ہے۔ اس کی غرض و غایت کیا ہے۔ کلچر کس طرح کے انسان بناتا ہے۔ پھر انسانوں کی قسموں پر بحث ہُوئی، کہ کس قسم کے انسان ہیں کتنی قسم کے انسان ہیں اور کس کلچر نے کس قسم کا انسان بنایا ہے۔ مجوسی انسان کا تصوّر قائم ہُوا وہ کیا ہے۔ ناسطین انسان کیا ہے پھر یہ بحث چلی کہ زندگی کی رُوح کیا ہے کیونکہ جو کلچر قائم ہو گا اس کے اندر زندگی کی رُوح جاری و ساری ہو گی۔ تو زندگی کی روح میں کہا گیا کہ دیوتاؤں کی اس سے نسبت ہے ایک اپالوی ہے کہ اس کا اس دیوتا سے تعلق ہے کہ جو حُسن پسند ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے جس کے اندر قرار ہے۔ پھر کہا گیا — ایک اور دیوتا ہے ڈائینسن، اور وہ جس طرح کا انسان بنانا چاہتا ہے ڈائینسن انسان اس میں حرکت ہوتی ہے، قوّت ہوتی ہے، غلبہ ہوتا ہے۔ پھر کہا گیا کہ ایک اور رُوح ہوتی ہے۔ فاوسٹین جو گوئٹے

کے مشہور ڈرامے سے ماخوذ ہے اور اس میں قرار اور بے قراری اور حرکت اور سکون کا امتزاج ہے۔ یہ بحث اور یہ بحثیں جتنی میں نے آپ کے سامنے بیان کیں آپ کہیں گے کہ :

شُد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا

پھر کلچر ہے کیا، یہ بحثیں تو صحیح ہیں اور یہ بحثیں ہوتی رہیں اور ہوتی رہیں گی۔

ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

مگر وہ خوابِ جوانی ہے کیا، جس کا نام کلچر ہے۔ اور اس وقت جس انداز میں کلچر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ وہ ایسے کہ :

اِک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

اس طرح کا یہ لفظ بن کے رہ گیا ہے جس طرح کا لفظ غریب استحصال ہے کہ جس محفل میں دیکھو اس لفظ پہ زور ہے اور بعض لوگوں کو استحصال کہنا بھی نہیں آتا وہ استیصال کہتے ہیں اور استحصال کا استحصال کرتے ہیں اور اس لیے مَیں کہتا ہُوں کہ یہ کلچر وہ لفظ ہے جس کا

بڑا استحصال ہُوا ہے۔

کلچر کی تعریف کیا ہے۔ جہاں تک کلچر کی تعریف کا تعلّق ہے اس کی تعریفیں اتنی ہیں کہ کوئی جامع و مانع تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ اس سلسلے میں کتاب Historical Materialism جو ماسکو میں چھپی ہے اس کے صفحہ ۱۲۴ پر لکھا ہے:

There are a great many definations of culture. Some say at least one sixty (160).

بعض لوگوں کے نزدیک اس کی کم سے کم ایک سو ساٹھ تعریفیں ہیں جو کی گئی ہیں اس لیے اگر آپ یہ چاہیں کہ مَیں کوئی اس کی ایسی جامع تعریف کر دوں کہ جس سے فوراً یہ ذہن میں آجائے یہ بہت مشکل ہو گا۔ لیکن ہمارے ہاں دو الفاظ ایسے ہیں جو اس کے متبادل کے طور پر بولے جاتے ہیں اور استعمال ہوتے ہیں۔ ایک تہذیب اور دوسرا ثقافت۔ تمدّن دوسری چیز ہے لیکن دو لفظ ایسے ہیں جو اس کے لیے خاص طور پہ استعمال ہوتے ہیں۔ ایک تہذیب اور دوسرا ثقافت۔ تہذیب فارسی میں بھی مستعمل ہے عربی زبان میں بھی۔

دونوں میں کم وبیش اس کا مفہوم ایک ہی ہے —— تہذیب کہتے ہیں حسن کاری کسی چیز کو خوب صورت بنانا، اس کی اصلاح کرنا اس کی تزئین کرنا اس لیے اس کا تعلّق خارج کی دُنیا سے ہے ظاہر کی دُنیا سے جسے بیرون بینی کہتے ہیں ظاہر کی دُنیا سے خارج کی دُنیا سے تہذیب کے نقش کا زیادہ تعلّق ہے۔

دوسرا لفظ ثقافت ہے اور یہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ علوم و فنون پر حاوی ہونا، مختلف علوم اور فنون میں مہارت حاصل کرنے کو ثقافت کہتے ہیں اور علوم و فنون کا سرچشمہ قلب و دماغ اور قلب و دماغ کا تعلّق ظاہر سے زیادہ باطن سے ہے۔اس لیے ثقافت کا لفظ باطن سے زیادہ تعلّق رکھتا ہے۔ تہذیب کا لفظ خارج اور ظاہر سے زیادہ متعلّق ہے۔ اور ثقافت کا لفظ باطن سے زیادہ متعلّق ہے۔ وہ بیرون بینی کا مفہوم دیتا ہے اور یہ درون بینی کا مفہوم دیتا ہے۔ اور کلچر وہ چیز ہے کہ جس میں درون بینی بھی ہے بیرون بینی بھی ہے جس کے اندر خارج بھی ہے جس کے

اندر باطن بھی ہے جس کے اندر ظاہری حُسن بھی ہے جس کے اندر باطنی علوم اور فنون کی نشو و نما بھی ہے اس لحاظ سے کلچر ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے اندر اخلاقی اقدار، عقائد، علوم، فنون، لباس، اطوار، ذہنی بالیدگی، ذوقِ جمال ہر چیز سمٹ کے آجاتی ہے۔ حُسنِ معاشرت سے لے کر لباس کی تراش خراش تک اس کے دائرے میں شامل ہیں اور فکر و فلسفہ نظام عقائد یہ سب کے سب بھی اس کے دائرۂ بحث سے متعلق ہیں۔ ایک معاشرے میں جو مسلمہ عادات ہوتی ہیں، اجتماعی عادات ہوتی ہیں، متفقہ عادات ہوتی ہیں۔ وہ اس معاشرے کے کلچر کا حصّہ ہوتی ہیں اور اس سلسلے میں بحث کو سمیٹنے کے لیے آپ اگر اپنے دین کو کوئی نام دینا چاہیں تو آپ اپنے دین کو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام خود ایک ثقافت ہے اور اس لحاظ سے تمام مسلمان ملکوں کی ثقافت اسلام ہے۔ البتہ ان کا تمدّن اور ان کی تہذیب، اور اس کے خارجی مظاہر کے اندر اختلاف ہوتا رہتا ہے۔ اور وہ جغرافیائی حدود اور موسمی

تغیرات اور زبانوں کے اختلاف وغیرہ کا مرہون منت ہے ۔ مثال کے طور پر اسلامی ثقافت میں طے ہے کہ حرام کیا ہے حلال کیا ہے ۔ تمام مسلمان ملک اس کی پابندی کرتے ہیں لیکن اس حلال چیز کو پکانے کا طریقہ کیا ہے ۔ اس کے اندر ایک مسلمان ملک دوسرے مسلمان مُلک سے مختلف ہے ۔ اس کے اندر ذوق کا اختلاف پایا جاتا ہے ۔ اس کی لذّت ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے تک بدلتی چلی جاتی ہے کہ کیسے حاصل کی جائے اور اس میں نمک مرچ کے ذوق کے اختلاف سے لے کر روٹی وغیرہ کے اختلافات شامل ہیں لیکن وہ بُنیادی شئے جو ثقافتی عنصر ہے حلال اور حرام وہ سب مُسلم معاشروں میں یکساں ہے ۔ اسی طرح لباس دیکھ لیجیے ۔ لباس کے بنیادی اصول اسلامی ثقافت میں مُسلّم ہیں ۔ وہ ہر مسلم معاشرے میں ایک سے ہیں کہ لباس ایسا ہو جو ستر پوش ہو حیا بدوش ہو ایسا ہو کہ جو مسرفانہ نہ ہو حدودِ استطاعت سے باہر نہ ہو ۔ ریشم کا نہ ہو مرد کے لیے عورت کے لیے عریاں نہ ہو ۔ کسی دوسری قوم کا مذہبی شعار نہ ہو ۔ ان چند باتوں سے

قطع نظر اور جیسا لباس آپ چاہیں پہن لیجیے۔ یہ بُنیادی اصول لباس کے مُسلم معاشرے میں ہر جگہ یکساں ہیں، ایک سے ہیں۔ لیکن لباس کی تراش خراش ہر معاشرے میں بدلتی چلی جاتی ہے۔ ایک مسلمان ملک کا لباس دوسرے مسلمان ملک کے لوگ نہیں پہنتے۔ لیکن جو بنیادی اصول رائج ہیں اور قائم ہیں۔ اس لباس کے فلسفہ کے اندر وہ سب کے ہاں یکساں ہیں تو اس سے، اس بحث سے یہ ظاہر ہُوا کہ تمدّن میں اختلاف ہوتا ہے۔ لیکن داخلی وحدت برقرار رہتی ہے۔ اسلامی ثقافت داخلی وحدت پیدا کرتی ہے۔ اور اس داخلی وحدت کے بعد اگر مظاہر میں اختلاف ہو۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا یہ عین تقاضۂ فطرت ہے۔ اور اس میں یکسانی کی کوشش کرنے کی فکر کرنا ضروری نہیں ہے اور اس کی چنداں اہمیت بھی نہیں ہے۔

اس کے بعد میں یہ عرض کروں گا کہ ثقافت کسی قوم کی زندگی میں اتنی اہمیت کیوں رکھتی ہے اب تو بدقسمتی یہ ہے کہ ثقافت کا لفظ یا کلچر کا لفظ ہو۔ تو اس کے ساتھ ہمارے ذہن میں شو کا لفظ ضرور اُبھرتا ہے کہ ثقافت

کی بات ہو رہی ہے۔ انٹرکان میں۔ کیا کوئی شو ہے۔ ثقافتی شو ہے کلچرل شو ہے۔ تو کلچر کے ساتھ شو ضروری ہے۔ اصل میں اس تہذیب نے ثقافت کو "شو بوائے" بنا کے رکھ دیا ہے۔

درحقیقت اس طرزِ فکر میں ہماری ذہنی مرعوبیت کو بڑا دخل ہے۔ ہمارے ملک کا ایک خاصا بڑا طبقہ اپنے افکار یورپ سے مستعار لیتا رہا ہے۔ وہ یورپ کو حق و باطل کا معیار قرار دیتا ہے۔ حالانکہ یورپی تہذیب اب زوال کے دَور میں داخل ہو گئی ہے اور اس کے افکار میں پہلی سی تازگی اور بالیدگی باقی نہیں رہی۔ یورپ میں جنسی بے راہ روی حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے اور اس کی ثقافت اس جنسی آوارگی سے بے حد متاثر ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کا خاندانی نظم درہم برہم ہو گیا ہے اور معاشرہ سے سکون و طمانیت اِلّا ماشاء اللّٰہ خارج ہو گئے ہیں۔

خود یورپ کے مفکرین اس صورتِ حال سے پریشان ہیں مگر ہم ہیں کہ مغرب کی نقالی سے نہیں چُوکتے۔ اگر ہم مغرب کی نقالی اسی طرح کرتے رہے تو ہمارے معاشرے کا انجام بھی وہی ہو گا جو مغربی معاشرہ کا ہو رہا ہے۔

اس لیے مَیں آپ سے اپیل کروں گا کہ آپ مغرب کے دام فریب میں نہ آئیے اور ثقافت کو صرف کھیل تماشا، دل لگی اور تفریح کے مظاہر تک مت محدود کر دیجیے۔ ثقافت میں اس سے کہیں زیادہ گہرائی اور معنویت ہے۔

تو ثقافت اور کلچر کو ہم محض "شو" کے تناظر میں دیکھتے ہیں اس کے سوا ہمیں توفیق ہی نہیں ہے کہ اس کے گہرے معنوں تک رسائی حاصل کریں لیکن آپ اگر قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ ان کی ثقافتوں کے عروج و زوال کی تاریخ ہے۔ ایک بالا دست فاتح زبردست قوم اس لیے اپنے غلبے کا پرچم لہراتی ہے اور زیادہ دیر تک اسے فتوحات نصیب رہتی ہیں اور ذہن و فکر پر بھی چھاتی ہیں کہ اس کا کلچر قوی تر ہوتا ہے اس کا کلچر مضبوط ہوتا ہے اس کا کلچر توانا ہوتا ہے اس کا کلچر صحت مند ہوتا ہے اس کے کلچر میں نمو کی زیادہ قوتیں ہوتی ہیں، اور وہ کلچر جو کمزور ہو۔ جو ضعیف ہو جو اپاہج ہو جس میں نمو کی قوتیں نہ ہوں جو ٹھٹھر گیا ہو جس میں جمود آ گیا ہو جس میں ٹھہراؤ آ گیا ہو جو زندگی

کی حرکت کا ساتھ نہ دے سکے وہ قوم ہمیشہ مغلوب ہوتی ہے۔اور قرآن حکیم جب یہ کہتا ہے:

کم من فئتہ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ

باذن اللہ ط (۲-۲۴۹)

تاریخ میں ایسا ہُوا ہے کہ ایک مختصر گروہ نے ایک بڑے گروہ پر فتح پائی ہے یہ گروہ غلبہ پاتا ہے اللہ کے حکم سے۔ تو اس سے مراد یہی ہے کہ ایک تتّر بتّر گروہ کی کوئی ثقافت نہیں ہوتی وہ اس گروہ سے ہمیشہ زیر ہوجاتا ہے اس سے مغلوب ہوجاتا ہے پھر شکست پاتا ہے جس کی ثقافت مضبوط ہوتی ہے جو منظم ہوتا ہے جو مہذب ہوتا ہے جو تہذیب اور ثقافت کے رشتے سے فرد اور معاشرے کا ربط قائم کرتا ہے جو اس کے ذہنوں کی جلا کرتا ہے تو وہ گروہ غلبہ پاتا ہے۔ وہ جماعت فتح یاب ہوتی ہے۔اس لحاظ سے آپ دیکھیں تو ثقافتوں کا عروج و زوال حقیقت میں قوموں کا عروج و زوال ہے۔

ہمارے ملک میں یہ بحث کیوں چلی کہ ہماری ثقافت کیا ہے اور ہماری ثقافت کیا ہونی چاہیے اور آخر ٹی وی کو

کیا ضرورت پڑی کہ پیسے دلا کر لوگوں کے انتشار فکر کا سامان
کرے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ گویا ہم ابھی تک کچھ بن نہیں
سکے وگرنہ جو معاشرہ تہذیبی طور پر ارتقائی یافتہ ہے اس
میں یہ بحث کبھی نہیں اٹھتی کہ اس کی ثقافت کیا ہے۔ وہ
ثقافت پیدا کرتا ہے۔ وہ ثقافت پر بحثیں نہیں کرتا۔ اس
کی ثقافت نظر آتی ہے۔ اس کی ثقافت محسوس ہوتی ہے اس
کی ثقافت کے رویہ پر Debate نہیں ہوتی اور نہ
اس قوم کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ ثقافت پر بحثیں
کرے اور اپنا وقت برباد کرے۔ اس سے معلوم یہ ہوتا
ہے کہ گویا ابھی ہم خود In the making
ہیں اور منزل کی تلاش میں ہیں۔

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

ہماری وہ مثال ہے ہم وہ قافلہ ہیں جو رواں دواں
ہے۔ لیکن اسے معلوم نہیں ہے کہ اسے کہاں جانا ہے۔ کچھ
لوگوں نے کم سے کم ہماری یہ حالت بنانا چاہی اور ہم نے ہی
یہ بحثیں کیوں پیدا کی ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ہماری ایک
دِقّت ہے۔ ہماری دِقّت ایک تو آزاد قوم کی دِقّت ہے۔ ایک

حقیقت پسندانہ تجزیہ اگر ہم کرنا چاہیں تو ہم یوں کہیں گے
کہ اصل میں ہُوا یہ کہ ہم آزاد ہُوئے ہمارا نیا ملک تھا۔
ایک ہزار سال ہم نے اس برصغیر پر حکومت کی تھی۔ اب جتنی
چیزیں تھیں ہماری، ثقافتی سرمایہ کے متعلّق ان میں سے بیشتر
حصّہ بھارت میں رہ گیا۔ تاج محل سے لے کر جامع مسجد اور
لال قلعہ مسجد قوّت الاسلام اور کیا کیا اب ہم نے کہا ہم اپنی
جغرافیائی حدود کے اندر وہ سرمایہ تلاش کریں کہ جس پر فخر کرسکیں
کہ دیکھو ہمارے پاس یہ چیزیں بھی تو ہیں۔

ہم ۲۸، ۲۹، ۳۰ سال کی عمر ہی تو نہیں رکھتے اس
مقصد کے لیے کچھ لوگوں نے ٹیکسلا، ہڑپہ اور موہنجوڈارو
سے اپنا رشتہ ملایا اور کہا کہ پانچ ہزار سالہ تہذیبیں ہمارے
ہاں پیدا ہوئی ہیں۔ اور یہ مُلک بڑا Rich ہے ثقافتی
لحاظ سے اس کی بڑی عمر ہے۔ بڑی تاریخ ہے۔ بڑا مرتبہ
اور مقام ہے۔ تضاد کہاں پیدا ہُوا، گڑبڑ کہاں پیدا
ہُوئی کہ ہمارا جغرافیہ ہماری تاریخ کے رستے میں رکاوٹ بن
گیا ہے۔

ہمارے جغرافیے نے ہماری تاریخ کا رستہ روک دیا،

لیکن جغرافیہ کبھی تاریخ کا بدل نہیں بنتا۔ تاریخ تاریخ ہے اور یہ کبھی نہیں ہوتا کہ جغرافیہ کتنا ہی بدل جائے کوئی قوم اپنے ماضی سے اور اپنی تاریخ سے اپنا رشتہ کاٹ لے جو قوم بھی اپنے ماضی سے اور اپنی تاریخ سے اپنا رشتہ کاٹتی ہے اس کی مثال اس پتنگ کی سی ہے جس کی ڈور کٹ جائے۔ اور وہ راہی کبھی منزل پر نہیں پہنچتا کہ جس کا کوئی سہارا نہ ہو۔ جس کا کوئی زادِ راہ نہ ہو۔ جس کا کوئی راہ بر نہ ہو۔ ہماری مثال وہ بن گئی جب ہم نے جغرافیہ کی وجہ سے اپنی ایک ہزار سالہ تاریخ جو برصغیر پاک و ہند میں تھی اس سے آنکھیں پھیر لیں۔ یہ مَیں نہیں کہتا کہ ماضی سے رشتہ کاٹنا غلط ہے۔ یہ کوئی رجعت پسند آدمی نہیں کہہ رہا ہے کسی کو یہ بھول نہیں ہونی چاہیے کہ ماضی کا لفظ سُن کر وہ مجھ پر یہ فتویٰ لگا دے کہ مَیں تو Reactionary ہونے کی بات کر رہا ہُوں۔ اور رجعت پرستی کی بات کر رہا ہوں۔ یہ بات خود لینن کہتا ہے۔ اس کتاب میں جس کا مَیں نے اوپر حوالہ دیا Historical Materialism اس کے صفحہ ۱۳۷ پر ہے:

Lenin said attempt made by

some pseudo revolutionaries to get the G,P.S.U. to produce a proletarian culture disregarding the cultural legacy of the past testify to their ignorance and were quite futile.

خود لینن نے کہا کہ کچھ لوگ جو ماضی کے ورثے سے آنکھیں بند کر لینا چاہتے ہیں اور خالص پرولتاری ثقافت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت میں ان کا یہ اقدام جہالت پر مبنی ہے اور وہ ایک عبث اور رائگاں کوشش کر رہے ہیں۔ تو کوئی قوم یہ afford نہیں کرتی کہ اس کا تعلّق ماضی سے کٹ جائے۔ یا اس کی تاریخ سے کٹ جائے۔ اس لیے ہماری دِقّت یہی ہوگی کہ ہم اپنے اس محدود علاقے کے اندر اپنے ثقافتی سرمائے کو تلاش کرنے کی کوشش کریں حالانکہ ہماری ثقافت تو تاریخ کے صفحات میں بکھری پڑی تھی۔ اور ماضی میں بکھری پڑی تھی اور اس کے اوراق ہر مُلک میں تھے

اُڑالی طوطیوں نے قمریوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

وہ تو ہر جگہ ورق بکھرے ہوئے تھے کہاں نہ تھے۔ وہ سب ہماری ثقافت کے اجزا تھے۔ مگر ہم نے کہا نہیں یہ ہماری ثقافت نہیں ہے اور ہمارا ماضی سے اپنی تاریخ سے کوئی تعلّق نہیں ہے۔ یہ وہ غلطی تھی جس کی وجہ سے ہم نے الگ الگ ثقافتوں کے نعرے لگائے۔ اور یہ کہا کہ چار ثقافتیں ہیں ہمارے مُلک میں سندھ کی الگ ثقافت ہے پنجاب کی الگ ثقافت ہے۔ سرحد کی الگ ہے، بلوچستان کی الگ ہے اور آپ نے دیکھا ہو گا، کہ یہ چار ثقافتوں کا نعرہ کچھ عرصہ پیشتر لگا۔ ۲۸، ۳۰ سال میں نہ لگ سکا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ایک غیر مُلکی مصنّف نے یہ بات کی وہ بھی کچھ اور پیرائے میں مگر اس سے پہلے جو بات کہی گئی تھی وہ چار قومیتوں کی تھی۔ یہ کہا گیا تھا کہ مُلک میں چار قومیتیں ہیں — مگر جب اس کو رد کیا گیا جب اس کا فکری محاذ پر مقابلہ ہُوا آئینی محاذ پر مقابلہ ہُوا جب اس کی تغلیط کر دی گئی، تردید کر دی گئی اس کا فکری جھول واضح کر دیا گیا تو پھر چار قومیتوں

کو نقاب پہنا کر چار ثقافتوں کے رُوپ میں لوگوں نے ہمارے سامنے پیش کر دیا کہ چار ثقافتیں ہیں۔ حقیقت میں یہ چار قومیتوں کا نعرہ ہے کہ جو دوسرے روپ میں سامنے آیا جو لوگ اتنے باہمت نہیں ہیں اتنے بہادر نہیں ہیں کہ وہ کھل کر بات کر سکیں اس لیے کہ کمین گاہوں میں گھسے ہُوئے ہیں انھیں یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ یہ نعرہ کھل کر لگاتے۔ انھوں نے پھر اس کو کیموفلاج کیا۔ اور چار ثقافتوں کا نعرہ ہمارے سامنے پیش کیا جو حقیقت میں چار قومیتوں کا بدل ہے۔ وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری علاقائی ثقافت کوئی الگ ثقافت نہیں ہے۔ جیسا کہ مَیں نے کہا ان چار صوبوں کا کیا سوال ہے جہاں جہاں مُسلم معاشرہ ہے وہ روح کے اعتبار سے، وہ ثقافت کے اعتبار سے باہم دگر مربوط ہیں جو بنیادی اُصول ہیں وہ سب کے سب یہاں یکساں ہیں۔ نظریاتی اور داخلی وحدت سب میں ایک ہے۔ فرق ایسا ہے جیسے ایک درخت، جڑیں اس کی ایک ہیں لیکن جب نشوونما پاتا ہے۔ اس کی شاخیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ اس پر پھُول کھلتے ہیں،

اس کی کسی شاخ کی ٹہنی مضبوط ہوتی ہے کسی کی پتلی ہوتی ہے کسی پر شگوفہ کم کھلتا ہے کسی پہ زیادہ اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ الگ الگ درخت ہیں —— یہی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک درخت ہے، ٹہنیاں الگ الگ ہیں مگر درخت ایک ہے۔ ایسے ہی ہماری بنیادی ثقافت فطری ثقافت ایک ہے داخلی وحدت ایک ہے، ہماری جڑیں ایک ہیں، اس سے جو درخت پھوٹتا ہے، اس سے جو شاخیں برگ و بار لا رہی ہیں، ان کے اندر اگر تنوع نظر آتا ہے تو یہ نظروں کا دھوکہ ہے۔ اگر ہم ان کو الگ الگ درختوں کا روپ دیں۔

اس ضمن میں مَیں آپ کی توجہ ہندوستانی اور انڈونیشی ثقافت کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہُوں۔ ہندوستان ایک وسیع و عریض مُلک ہے اور اس میں کئی نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ اس کے صوبوں کی تعداد بھی ہمارے صوبوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان کے تمام لوگ اپنے آپ کو ایک واحد ثقافت کا جزو تصوّر کرتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ اُتر پردیش کی ثقافت اور ہے

بہار کی ثقافت اور ہے اور مہاراشٹر کی ثقافت اور ہے حالانکہ بود و باش، طرزِ رہائش اور زبان کے اعتبار سے ان صوبوں کی آبادی میں گوناگوں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح انڈونیشیا بھی وسعت کے لحاظ سے ایک عظیم مُلک ہے۔ اگرچہ آبادی کے لحاظ سے وہ اتنا بڑا نہیں ہے۔ یہ مُلک متعدّد جزائر پر مشتمل ہے۔ جن میں ہر جزیرہ کی آبادی دوسرے سے طرز بود و ماند اور طریق معاشرت میں دوسرے جزیروں کی آبادی سے مختلف ہے۔ مگر جب سے انڈونیشیا آزاد ہُوا ہے اس وقت سے یہ جزائر ایک ثقافتی وحدت بن گئے ہیں اور اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ سماٹرا کی ثقافت اور ہے اور جاوا کی ثقافت اور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر مُلک جو آزاد اور خود مختار ہوتا ہے اپنی ثقافت میں وحدت و یک رنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ثقافتی اختلافات کو گھٹاتا ہے۔ کیونکہ اگر ثقافتی اختلافات شدّت اختیار کرلیں تو وہ مُلک آزاد اور خود مختار مُلک کی حیثیت سے قائم نہیں رہ سکتا۔ ثقافتی اختلافات کی زد بالآخر سیاست پر پڑتی ہے اس لیے جو

ملک بھی حال ہی میں آزاد ہوئے ہیں وہ سب ثقافتی اتحاد کی طرف گامزن ہیں۔ ان حالات میں پاکستان میں مختلف ثقافتوں کا نعرہ لگانا درحقیقت پاکستان کی سالمیت پر حملہ کرنے کے برابر ہے۔

یہ ایک انتہا تھی، دوسری انتہا Ideologism ہے اور مجھے معاف کیا جائے جب فکری بحثیں ہوتی ہیں تو پھر اس کے اندر کچھ اختلافات کے پہلو نکل ہی آتے ہیں۔ یہ پیدا ہوئی Pan Islamism کی تحریک کے بطن سے۔

Ideologism یہ بہت عمدہ خواہش ہے، مستقبل کی خواہش ہے۔ مستقبل کا حسین خواب ہے اور کبھی نہ کبھی یہ ضرور پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ اس کی تعبیر نکلے گی۔ لیکن حقیقت پسندی کچھ اور کہتی ہے اس لیے کہ ہم حقائق کی دُنیا میں ہیں۔ تحریکِ خلافت کے اثرات نے ہمارے ذہنوں میں یہ بات کسی انداز میں کچھ نہ کچھ گوشوں میں ضرور پیدا کر دی کہ ہم زیادہ نظری ہو گئے اور نظریاتی خلا میں ہم سوچتے اور بات کرتے ہیں اور خود جو اپنے وطنی تقاضے ہیں اور حُبِّ وطن

کے تقاضے ہیں جو زمینی رشتہ ہے اس کو بسا اوقات ہم فراموش کر دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت، تلخ حقیقت ہمارا سامنا کرتی ہے۔ پھر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ تو ایک خواہش تھی، وہ تو ایک مستقبل کا منصوبہ تھا کہ وہ ایک Wishful Thinking تھی، وہ ایک نظریاتی مثالیت تھی کہ جو ابھی تک شرمندۂ تعبیر ہونے کو ہے۔ ہم تو ابھی ایک اور دُنیا میں ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو سب مسلمان حکومتیں ختم ہو کر ایک حکومت بن جاتیں کہ یہی تحریکِ خلافت کی بات ہے مگر نہیں حقیقت کی دُنیا بتاتی ہے کہ الگ الگ مُلک ہیں، مسلمان حکومتیں الگ الگ ہیں۔ ان کے اپنے الگ الگ آئین ہیں، وہ خود مختار ہیں، ان کے ہاں آنے جانے کے لیے پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بسا اوقات ایک مسلمان مُلک کے اختلافات دوسرے مسلمان مُلک سے بھی ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں ہمیں یہ غور کرنا پڑے گا کہ جس ثقافت کو ہم پاکستانی ثقافت کہتے ہیں، کیا اس کا تعلّق محض مسلمانوں سے ہو گا یا اس زمین سے بھی ہو گا۔ مَیں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تنہا نظریے کی محبّت سے بھی پاکستانی ثقافت

نہیں بنتی۔ اور تنہا زمین اور وطن کی محبّت سے بھی پاکستانی ثقافت نہیں بنتی۔ پاکستان کی ثقافت زمین کی محبّت اور نظریے کی محبّت کے اجتماع سے بنی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بحیثیتِ مسلمان ہمیں ہر اسلامی مُلک عزیز ہے۔ مگر پاکستان سب سے زیادہ پیارا ہے۔ زیادہ پیارا ہے اِس لیے کہ ہمارا مُلک ہے۔ آخر وطن کا تعلّق ہے، وطن کا رشتہ ہے۔ تو اِن دو انتہا پسندوں میں ہم مارے گئے۔ ایک نے ماضی اور تاریخ اور نظریے سے ہمارا رشتہ کاٹنا چاہا۔ اور ایک نے زمین سے ہمارا رشتہ کاٹنا چاہا۔ اس نے صرف نظریاتی حدود کی بات کی، اس نے صرف جغرافیائی حدود کی بات کی اور نظریے اور جغرافیہ کی حدود کے صحیح امتزاج کو ہم بھول گئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ آج تک یہ بحثیں چلتی آرہی ہیں کہ پاکستانی قومیت کیا ہے؟ پاکستانی ثقافت کیا ہے؟ ایک مرتبہ ہی بحث ختم ہو جانی چاہیے کہ پاکستانی قومیت پاکستانی ثقافتی نظریے سے محبت اور وطن کی سرزمین سے محبت کا نام ہے اور ان دونوں چیزوں سے مل کر پاکستانی قومیت اور پاکستانی ثقافت استوار ہوتی ہے اسی طرح ایک دِقّت

اور بھی پیدا ہوئی۔ وہ یہ کہ ہم تضادات کا شکار ہیں۔ ہم نام اسلام کا لیتے ہیں مگر ہم مجتہدانہ بصیرت سے تہی دامن ہیں۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے۔ مَیں نے کہا وہ کسی ٹھہرے ہُوئے جوہڑ کا نام نہیں ہے۔ اگر زندگی جوہڑ بن جائے تو اس میں بدبو پیدا ہو جائے گی۔ مگر زندگی تو ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ وہ آگے بڑھ رہی ہے اور زندگی صرف اس کا ساتھ دے سکتی ہے کہ جو اپنے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جو جوہڑ بن کے رہ جائے اس کے اندر بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ پھر زندگی کے قافلے کا سالار نہیں بن سکتا۔ وہ زندگی کے قافلے کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ ہمارے ہاں مصیبت یہی ہے کہ ہم آج سے چودہ سو سال کی پہلے کی اسلامی ثقافت کو دیکھتے ہیں لیکن ہم یہ بھُول جاتے ہیں کہ کسی انقلابی تحریک کی جب ابتدا ہوتی ہے تو شروع میں جتنے بھی سال کسی تحریک کے ہوتے ہیں وہ بہت سختی کے ہوتے ہیں۔ ان کے اندر بہت سی جائز چیزوں پر بھی پابندی ہوتی ہے کہ کہیں سہل انگار نہ ہو جائے۔ کہیں وہ اپنی کمر کھول نہ لے۔ کہیں ستانے نہ لگے اس لیے وہ چیزیں جو زندگی کا جائز

لطف ہیں اور حسین ہیں ان میں لطافت ہے نزاکت ہے ان سے بھی بسا اوقات اسے روکا جاسکتا ہے لیکن پھر منزل آتی ہے کہ جب ان چیزوں کے اندر حُسن کاری کی قوتیں آگے بڑھتی ہیں۔ موسیقی اور مصوّری کو دیکھ لیجیے۔ یوں کہنے کو ہمارے ہاں لوگ ہیں جو ان کو حرام کہنے میں اپنا سارا زور صرف کر دیتے ہیں۔ مگر ہر مُسلم معاشرہ میں یہ چیزیں چل رہی ہیں۔ ساڑھے تیرہ سو صدیوں سے چل رہی ہیں ان کے اندر مسلمان باکمال پیدا ہوئے ہیں باکمال مصوّر پیدا ہوئے ہیں۔ باکمال موسیقار پیدا ہوئے ہیں انھوں نے موسیقی کے اندر نئی نئی راہیں نکالی ہیں مصوّری کو نئی نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے۔ پھر کیا ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چند سالوں کو چھوڑ کر صدیوں سے ہم گم گشتہ راہ ہیں ہم غلط کار ہیں ہماری پوری اُمّت اس پر قائم ہو گئی ہے اور غلطی پر قائم ہو گئی ہے یا ہم یہ کہلانا چاہتے ہیں کہ ہمارے عقائد ناقابِل عمل ہیں۔ مشاھدہ تو یہ ہے کہ ان کو زندگی سے نکالا نہیں جا سکتا کیوں کہ یہ زندگی کا نمک ہیں۔ مگر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں غلط اور حرام ہیں۔ اس طرح ہم اپنی تاریخ میں ایک دوئی ایک

تضاد پاتے ہیں۔لیکن سوال یہ ہے کہ پھر ہمیں اپنے ادب اور شاعری سے کیوں دلچسپی ہے ہم کہتے ہیں موسیقی غلط ہے۔ لیکن غزل سرائی ہمیں محبوب بھی ہے۔کچھ ہیں جو کھلے بندوں سُنتے ہیں کچھ ہیں غسل خانے میں سُنتے ہیں اپنی ہی گنگناہٹ کو سُن لیتے ہیں۔ ریڈیو کس گھر میں نہیں ہے۔لیکن یہ بھی چل رہا ہے کہ یہ سب کچھ غلط ہے اور اس کے فتوے بھی ہیں۔اس کے خلاف عمل بھی ہے اور خود جو بے چارے موسیقار ہیں، مصور ہیں اچھے آرٹسٹ ہیں وہ اس نفاق میں مبتلا ہیں کہتے ہیں خدا جانے بخشش ہوگی کہ نہیں۔ اچھی غزل گا رہے ہیں کل اللہ میاں سولی پر نہ لٹکا دیں اس جرم میں کہ تم نے اچھی غزل کیوں گائی ہے۔

اس تضاد سے ہمیں نکلنا پڑے گا یا یہ مانیے کہ چودہ صدیوں میں صرف آپ کی فکر صحیح ہے اور چودہ صدیوں میں جو عمل ہے آپ کی ملت کا اور آپ کے مسلمانوں کا۔ ہر صدی میں اور ہر صدی کے موڑ پر وہ غلط ہے یا یہ مانیے آپ کی تشریح غلط ہے آپ نے جو احکام سمجھے ہیں جس انداز میں ان کی جو آپ نے جو تعبیر کی ہے وہ غلط ہے یا پھر یہ مانیے کہ اسلام

ناقابلِ عمل ہے — اس دور میں نہیں چل سکتا۔ ان دونوں میں سے ایک بات تو تسلیم کیجیے۔ یا مجھے وہ معاشرہ بنا کے دکھا دیجیے اس دَور میں جس میں سے یہ چیزیں آپ منہا کر دیں گے۔ جہاں موسیقی نہ ہو گی جہاں مصوّری نہ ہو گی۔ جہاں آرٹ نہ ہو گا۔ مجھے یا اس معاشرے کی کوئی جھلک دکھا دیجیے اس دَور میں کونسا مُلک ہے جس کے ریڈیو سے موسیقی نشر نہیں ہوتی۔ وہ بھی جو مذہبی حکومت ہے اس کے ریڈیو سے اس کے نشری ذرائع سے کیا موسیقی نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں اگر ۴۰ فی صد ہوتی ہے وہاں ۶۰ فی صد ہوتی ہے تو پھر اس تضاد کو ختم کرنا ہو گا۔ تعبیر کرنی ہو گی۔ سوچنا ہو گا سمجھنا ہو گا کہ کیا اس کے لیے ہم غلط فہمی میں تو مبتلا نہیں ہیں۔ کیا اس معاملے کی کوئی اور حدود معین کرنے کی ضرورت ہے، کوئی تعبیر جدید کی ضرورت ہے۔ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ ہم غلط سمجھ رہے ہیں کیا ہم یہ نہیں سمجھ سکتے اور نہیں سمجھا سکتے کہ ان میں کوئی چیز فی نفسہٖ غلط نہیں ہے بلکہ اس کا استعمال اس کو غلط یا صحیح بناتا ہے۔ وہ موسیقی، وہ مصوّری، وہ آرٹ جس کا محرک جس کی غرض و غایت محض جنس ہے وہ غلط ہے۔ وہ گمراہ کن

ہے۔ وہ معاشرے کے لیے لعنت ہے۔ وہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کا روگ ہے۔ وہ بیمار ثقافت کا مظہر ہے۔ لیکن اگر پاکیزہ تفریح کا حصول مقصود ہو۔ آرٹ سے اور موسیقی سے اور مصوّری سے یا اسے کسی اعلیٰ تر مقصد کے لیے استعمال کیا جائے جیسا کہ ایک زمانے میں صوفیا نے اسے استعمال کیا تو پھر اس کی نوعیت بدل جائے گی۔ کسی چیز کا مقصد استعمال اس کو اچھا یا بُرا بناتا ہے۔ فی نفسہٖ ان چیزوں کے اندر کوئی خرابی اور برائی نہیں ہے۔ اس صورت حال پر بھی ہم کو غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں اپنے اندر سے تضاد ختم کرنا ہے، اگر ہمیں پاکستانی ثقافت بنانی ہے، اگر ہمیں نئی نسل کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ اگر اسے انتشار فکر سے بچانا ہے۔ اور مَیں یہ بھی عرض کروں گا کہ پاکستانی ثقافت کی بحث ماضی میں اس لیے بھی طے نہ پا سکی اور اس لیے بھی ہم اس معاملے میں سرگرداں اور پریشان ہیں کیونکہ ہمارے ہاں ایک قومی ثقافت کا منطقی نتیجہ قومی یکجہتی ہے، ایک وحدت کا پیغام دینے والی ثقافت ہے۔ ان دونوں کا آپس میں بڑا ہی منطقی ربط ہے۔ ایسا جیسا پلکوں اور آنکھوں کا ہے۔ ان دونوں

کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ہماری ایک دِقّت رہی اس کو ماننا پڑے گا۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان خواہش کے باوجود اور جذبات کے باوجود اور گہرے عشق اور لگاؤ کے باوجود کہ جو اس خطّے سے ہم کو تھا۔ اس کے باوجود مَیں یہ کہتا ہوں کہ کچھ چیزیں ایسی تھیں کہ جو بہر حال ہمارے اور ان کے درمیان کبھی کبھی داخلی وحدت پر اثر انداز ہوتی تھیں۔ فاصلہ کے بیچ میں ایک مُلک حائل، ہم اس کا ڈیفنس نہیں کر سکتے۔ زبان ایک مختلف زبان۔ مذہب ایک مگر ثقافتی مظاہر مختلف، کھانے پینے کی عادات، لباس، آداب و اطوار یہ الگ، داخلی وحدت عقیدے سے قائم تھی اسے ہمیشہ Exploit بھی کیا گیا مگر اس پر عمل ہی کبھی نہیں ہُوا۔ اور وہ عقیدہ کبھی مساوات اس طرح قائم نہ کر سکا کہ جو اُس خطّے کے آدمی کو مطمئن کرتا۔ انصاف اور مساوات کی اور اخوت کی فضا قائم ہوتی۔ عدم تحفظ کا احساس ختم ہوتا۔ وہ فضا قائم نہ ہوئی اس لیے وہ خطہ ہم سے کٹ گیا۔ قومی یکجہتی اس زمانے میں پیدا نہ ہو سکی اور یہاں مَیں کہتا چلوں کہ اس مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے باوجود، بنگلہ دیش

کی علیٰحدگی کے باوجود دو قومی نظریے پر حرف نہیں آیا۔ اس لیے کہ دو قومی نظریے پر ہی بنگلہ دیش بہر حال اس استنبول کی اسلامی کانفرنس میں شریک ہوا۔ ایک زمانہ تھا جب خلافت عثمانیہ تھی۔ ایک خلافت تھی پھر مسلمان ملک کٹتے چلے گئے۔ الگ الگ انھوں نے اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔ اس سے نظریہ پر کوئی آنچ، کوئی حرف نہیں آیا۔ نظریہ وہی رہا۔ ایسے ہی بنگلہ دیش اگر الگ ہوا تو ایک مسلم حکومت کا مسلمانوں کی ایک حکومت کا اضافہ اور ہوگیا۔ اس سے دو قومی نظریے کی تغلیط اور تردید نہیں ہوئی۔ اب صورت حال مختلف ہے اب قومی یک جہتی پیدا ہو رہی ہے اور پیدا ہوگی اور اس کے درمیان جو رکاوٹ بھی پیدا ہوگی۔ اس کا سر کچلنے کے لیے ہمارے پاس سامان موجود ہے۔ اب کسی کو قومی وحدت کے اندر رخنہ پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

انیسویں صدی کے سیاسی فلسفے کے مطابق کسی ملک میں قومی یک جہتی پیدا کرنے کے لیے چند چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک تو یہ کہ مستند مذہب موجود ہو اس قوم کے اندر، دوسری چیز یہ ضروری ہے کہ ایک جغرافیہ ہو اس کا۔ ایک زبان ہو اس کی ،

اس کا ایک سیاسی نظام ہو۔ ایک مستند تاریخ کی وہ مالک ہو یہ ساری خصوصیات آج کے پاکستان پر صادق آتی ہیں۔ آج کے پاکستان میں یہ ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ آپ ایک ایک بات کو دیکھیں۔ آج چاروں صوبوں میں ہمارا دین مستند ہے چاروں صوبوں میں ایک جغرافیہ ہے۔ صبح اگر ایک آدمی چلے، شام کو پہنچ جائے گا۔ پشاور سے پتھر مارے تو کراچی میں آگرے گا۔ اور یہاں اگر کسی کے پاؤں میں کانٹا چبھے اُس کی آواز —— —— وہ درہ خیبر میں سُنائی دے گی۔ رشتے ناطے ہمارے ہیں۔ سندھ کے پنجاب سے۔ پنجاب کے سرحد سے بلوچستان کے سندھ سے۔ رشتے ناطے میں ہم مربوط ہیں۔ چاروں صوبوں کے لوگ ایک جغرافیہ ہمارا ہے دفاعی اعتبار سے۔ اگر ہم انتظامی اعتبار سے ایک وحدت نہ بھی ہوں مگر ہم جغرافیائی اعتبار سے ایک وحدت ہیں۔ ہم ون یونٹ انتظامی اعتبار سے نہیں ہیں لیکن جغرافیائی اعتبار سے ہم آج بھی ون یونٹ ہیں ایک سیاسی نظام ہمارا ہے۔ فیڈریشن ہے۔ ایک سیاسی پارٹی چاروں صوبوں میں برسرکار ہے اور ایک لیڈر ہے۔ جس کا چاروں صوبوں کے عوام سے تعلّق ہے اور چاروں صوبوں

کے عوام کے دلوں میں اس کی محبت ہے اور جو صوبائیت
کی نظر سے مسائل کو نہیں دیکھتا بلکہ ملکی اور قومی نظر سے مسائل
کو دیکھتا ہے۔ یہ بھی آج کی صورت حال میں ہمیں ایک Privilege
حاصل ہے۔ اور پھر ایک مستند زبان بھی ہے۔ علاقائی
زبانیں ہیں۔ ان کی اپنی قدر و قیمت ہے ان سے کسی کو کوئی
تعصب نہیں ہو سکتا۔ وہ سب Rich ہیں
ان کا سرمایہ ہمارا سرمایہ ہے اور ہمیں اس سے کوئی دوئی
نہیں۔ کوئی غیریت نہیں۔ ان کی نشو و نما ہماری اپنی نشو و نما
ہے۔ لیکن ایک زبان ایسی ہونی چاہیے تھی جو چاروں
صوبوں کے درمیان اشتراک اور ہم آہنگی کا کام دے
اور وہ اردو زبان ہے جو چاروں صوبوں میں بولی جاتی ہے۔

اور جو چاروں صوبوں کے دلوں کی دھڑکنوں کی ترجمان
ہے اور کمی ایک اور بھی تھی۔ اردو زبان کے ساتھ کہ یہ صرف
ہمارے بیرونی اور خارجی مظاہر کی وحدت میں کام دیتی
ہے۔ داخلی وحدت کے استحکام کے لیے ایک زبان کی ضرورت
تھی۔ وہ عربی زبان ہے۔ کاش کہ ہم نے عربی زبان کو رائج

کیا ہوتا۔ پاکستان کے بنتے ہی تو وہ صورت حال آج نظر نہ آتی جو پیدا ہوئی۔ زبانوں کے جھگڑے نہ ہوتے۔ الیسٹ اور ویسٹ کے اندر یہ تنازعہ نہ پیدا ہوتا اگر عربی زبان کو ہم نے رواج دیا ہوتا۔ ہماری داخلی وحدت مستحکم ہوتی۔ اس لیے کہ ہماری اقدار کا سرچشمہ یہ زبان ہے۔ ہماری ثقافتی دولت اس کے اندر ہے۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ عربی زبان نے انسانی فکر و فلسفہ، اخلاقیات و مذہبیات اور تہذیب و تمدن پر اَنمٹ اور مثبت نقوش ثبت کیے ہیں۔ شروع سے آج تک عربی زبان مذہب، ادب، انتظامیہ، تجارت، صحافت اور سائنس و ٹیکنالوجی کی زبان رہی ہے۔ اِسی آفاقی مزاج کی وجہ سے عربی زبان صحرائے عرب سے نکل کر سارے عالم میں پھیل گئی۔ عراق ہو یا شام، فلسطین ہو یا مصر، شمالی افریقہ ہو یا سوڈان، نائیجیریا ہو یا مغربی صحارا، زنجبار ہو یا اسپین، جزائر بالٹک ہوں یا سسلی ہر جگہ اس کا ڈنکا بج رہا ہے۔ دریائے فرات سے بحرِ اوقیانوس تک عربی زبان کا دائرہ جس وسعت کے ساتھ پھیلا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ پاکستان میں عربی زبان مسلمانوں کے ساتھ ۷۱۱ء میں آئی لیکن تاریخی حقائق

اس کے برعکس ہیں۔ یہ بات بعض اہل علم دلائل کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں کہ دو ہزار سال قبل مسیح مہابھارت کے دَور میں جب کورو اور پانڈو کی جنگ جاری تھی، عربی زبان سندھ میں خفیہ زبان کی حیثیت سے بولی جاتی تھی۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ کوٹری کے رہنے والے عبدالواحد سندھی کے اشعار عرب زمانۂ جاہلیت کی شاعری کے شاہکار مجموعہ حماسہ میں شامل ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم نے اس آفاقی زبان کو — اپنی زبان کو پاکستان میں فروغ دیا ہوتا اور دونوں خطوں میں اس پر زور دیا ہوتا تو ہمیں اپنے کلچر سے بھی آگہی و شناسائی حاصل ہوتی اور ملک بھی نہ ٹوٹتا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ہم عربی زبان کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ مگر یہی کچھ کافی نہیں خدا وہ دن لائے جب ہم اسے لازمی مضمون کی حیثیت سے اپنی درس گاہوں میں رائج کریں اور نئی نسل کو ملی انا اور خودی کی دولت سے مالا مال کر کے اپنے کلچر کی عظمتوں سے آشنا کر سکیں۔

سامعین کرام! یہ ہیں چند اشارات جو مَیں کلچر کے مسئلہ پر گفت گو کرتے ہوئے آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ آپ کے سیمینار میں حصّہ لینے والے مفکّرین کا فرض ہے کہ ان کی روشنی

یں ان مغالطوں کو ردّ کریں، ان کے پرخچے اڑا دیں۔ دھجیاں بکھیر دیں ان مغالطوں کی جن کا تار و پود سازشوں سے بنایا گیا ہے اور جن کے ذریعے ہمارے ذہنوں کو منتشر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ثابت کر دیا جائے کہ اِس مُلک کے لوگ چار ثقافتوں کو ردّ کر چکے ہیں۔ ایسے کسی نعرے کی مُلک میں گنجائش نہیں ہے۔ پاکستان میں صرف ایک ثقافت ہو گی اور وہ صرف پاکستانی ثقافت ہے جس کی داخلی وحدت اسلام کے نظریے سے عبارت ہے اور جس کے اندر گہرائی اور گیرائی ہے اور اخذ و قبول کی اتنی صلاحیت ہے، جس کا مذہب اتنا انقلابی ہے کہ وہ قیامت تک کے ہونے والے انقلابات کی اچھی باتوں کو اپنے جلو میں لے کر آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کے اندر عرب کا سوزِ دروں بھی ہے عجم کا حُسنِ طبیعت بھی ہے۔ جس کے اندر ذوقِ جمال بھی ہے ذوقِ جلال بھی ہے۔ جس کے اندر شعلہ بھی ہے شبنم بھی ہے۔ اس پاکستانی ثقافت کو انشاءُ اللہ فروغ ہو گا۔ اور مَیں نیشنل کونسل آف کلچر اینڈ آرٹ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اس نے یہ سیمینار منعقد کیا اور اس کے مفکّرین کے لیے اقبال کے ان چار شعروں کو مَیں اسلامی ثقافت اور

پاکستانی ثقافت کا عنوان قرار دے کر رخصت چاہوں گا حقیقت میں اقبال نے اس میں اسلامی ثقافت کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ اور وہ شعر یہ ہیں اور انھیں پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمالِ جنُوں

طلوع ہے صفت آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثال زمانہ گونا گوں

نہ اس میں عصر رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہد کہُن کے فسانہ و افسوں

عناصر اس کے ہیں رُوح القدس کا ذوق جمال
عجم کا حُسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں!

مولانا کوثر نیازی کی

ایمان افروز کتابیں

اِسلام ہمارا دین — دینی، سیاسی، ثقافتی اور اخلاقی مسائل پر مضامین -/۳۰ روپے

بصیرت — کلام اللہ کی اُن آیات کی تشریح جو روزمرہ زندگی سے متعلق ہیں -/۲۰ روپے

بنیادی حقیقتیں — اسلام کے بنیادی حقائق مختصر الفاظ میں -/۱۴ روپے

آئینۂ تثلیث — عیسائی مشنریوں کے لیے آئینۂ عبرت -/۱۴ روپے

تخلیقِ آدم — ارتقاءِ انسانی پر ڈاروِن کے نظریات کا ابطال -/۱۴ روپے

اسلام ہمارا رہنما ہے — اسلامی تعلیمات پر بہترین موادِ مطالعہ -/۱۸ روپے

مطالعۂ تاریخ — مغربی مورخین کے نظریات کا ابطال -/۹ روپے

زرِ گُل — نعتوں، نظموں اور غزلوں کا دلنواز مجموعہ -/۲۰ روپے

ذکرِ حُسینؓ — شہادتِ حسینؓ پر تاریخ کے آئینہ میں مدلّل کتاب -/۱۲ روپے

اندازِ بیاں — ادبی، سیاسی اور عوامی خطبات کا ایک عظیم مجموعہ -/۶۰ روپے

رہنمائے حج — سفرِ حج پر ایک جامع اور مکمل رہبر کتاب -/۱۵ روپے

ایک ہفتہ چین میں — دورۂ چین کے شگفتہ تاثرات -/۱۵ روپے

ذکرِ رسولؐ — عیدِ میلاد النبیؐ کی شرعی حیثیت اور دینی تقاضے -/۱۵ روپے

اِسلام کے معاشی تصوّرات — اسلوب کے اعتبار سے ایک منفرد خطبہ -/۴ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز — لاہور، حیدرآباد، کراچی

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No.
★ MAILSI ★

[ام جدل]

02 MAR 2021

مولانا کوثر نیازی ۲۱ اپریل ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئے۔ وہ ابھی نوعمر طالب علم ہی تھے کہ انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور کچھ عرصہ تک مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے اُردو، عربی اور فارسی میں آنرز کیا۔ زمانہ طالب علمی کے فوراً بعد وہ صحافت سے وابستہ ہوگئے اور لاہور سے شائع ہونے والے روزنامہ "تسنیم" اور "کوثر" کے مدیر رہے۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء میں "شہاب" جاری کیا جو عوامی بیداری کے زمانے میں پاکستان میں سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہونے والا ہفت روزہ تھا۔

۱۹۷۰ء میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے اور انھیں پاکستان پیپلز پارٹی کا سیکرٹری اطلاعات مقرر کیا گیا۔

یحییٰ خان کے دورِ حکومت میں مارشل لاء عدالت نے انھیں ان کی تقاریر اور تحریروں کی بنا پر پانچ سال کی سزا دی لیکن اسی سال دسمبر میں جبکہ ابھی وہ پابندِ سلاسل ہی تھے ایک لاکھ ووٹ حاصل کرکے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور ان کے سات حریفوں کی ضمانتیں بھی ضبط ہوگئیں۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو مولانا کوثر نیازی کو ۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو صدر کا مشیر برائے اطلاعات و نشریات، اوقاف و حج مقرر کیا گیا اور ۲۶ مارچ ۱۹۷۲ء کو انھیں اطلاعات و نشریات کا وزیر مقرر کیا گیا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو وہ پاکستان میں پہلی مرتبہ قائم ہونے والی وزارت مذہبی امور کے وزیر مقرر ہوئے۔

وہ اُردو زبان میں ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کی کئی کتابوں کا فارسی، انگریزی اور عربی زبان میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے۔ ان کے قلم و زبان سے نکلے ہوئے الفاظ عوام کے لیے روشنی اور اُمید کا پیغام رکھتے ہیں مگر استحصالی نظام کے لیے جلتے انگارے